برگِ نَے

ترتیب

اعتبارِ نغمہ

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب شاعری فنکار کے لیے باعثِ ننگ نہیں تھی۔ گیت گانے والا گاؤں گاؤں، نگری نگری گھومتا پھرتا تھا اور باٹ باٹ پہ عشق و محبت، دلیری، شجاعت، سیر و تفریح اور اَن جانے دیسوں کے نغمے گاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی بہت ہی سیدھا سادا اور رس بھرا ساز ہوتا تھا جس کی دُھن پہ اس کے سارے گیت ڈھلتے تھے اور گلے سے باہر نکلتے ہی دلوں میں اُتر جاتے تھے وہ جن لوگوں میں بیٹھ جاتا ان کے دلوں کا تار ملا لیتا۔ جانی پہچانی دھرتی کا ہر گوشہ اور دھڑکنوں کے ساتے مسکن اس کی جاگیر تھے۔ پاس پڑوس کے سارے باسی اس کی آواز پر فیضہ تھے کہنے والا ایک تھا اور سننے والے ہزاروں اور ان ہزاروں کے دل اس کی مٹھی میں تھے۔ جدھر اس کی آواز پھرتی تھی ادھر اس کا سامعہ کھنچ کر چلا جاتا تھا۔ شاعر اور اس کے سامعین میں اگر کوئی حدِّ فاصل تھی تو یہی کہہ سکتا تھا اور یہ سن سکتے تھے۔ یہ دیوارِ چین بھی جذب و کیف کے مراحل میں ٹوٹتی پھوٹتی رہتی تھی۔ سننے والوں کی دھڑکنیں اس کی آواز میں شامل تھیں، ان کے ذہن کی ساری لرزشیں اس کے ساز میں جاگ اُٹھتی تھیں۔ اس دمن تو شدم تو من شدی، کے مراحل میں کوئی فاصلے نہ تھے جو مٹ نہیں سکتے تھے اور کوئی روک نہیں تھی جو ان کو جُدا کر سکتی تھی۔ اسے پہچاننے والے اسے بھاٹ کہتے تھے، موجد اور خالق کا نام دیتے تھے اور اس کے ذریعے دھرتی کا رابطہ آسانوں سے جا ملتا تھا۔

مگر دھرتی پر حکومت کرنے والوں کو اس کی فرماں روائی پہ، اس کی گرفت اور اثر و نفوذ پہ حسد ہوا۔ وہ بھی دلوں پر حکومت کرنا چاہتے تھے۔ دونوں کا ملاپ ہُوا مگر منافقت اور جلاپے کی بنیادوں پہ اس مقصدی مصالحت سے حکمرانوں نے اسے کہا کہ ہماری دلیری، ہمارے عشق ہماری سیر و سیاحت اور تفریح کے ترانے گاؤ۔ بھاٹ اب بھٹئی کرنے پر اُتر آیا۔ شاید اسے یہ غرور ہو گیا تھا کہ میں جب بھی اور جیسے بھی چاہوں سننے والوں کو رجھا سکتا ہوں، ان کا رُخ پھیر سکتا ہوں۔ درباری سخن سازنے فنِ سخن رانی ایجاد کیا، دلوں میں گھر کرنے کے اصول وضع کیے اور جو چیز کبھی اپنے آپ ہو جایا کرتی تھی اُسے اپنی مرضی سے پیدا کرنے کے لیے طریقے سلیقے ترتیب دیے۔ مگر آہستہ آہستہ وہ ان ہتھ پھیریوں کا شکار ہو کے رہ گیا۔ شطرنج کی چالوں نے اسے ایسا اُلجھایا کہ وہ انھی میں پھنس کر رہ گیا اور سُننے والے اس کی آواز سے دُور ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ ایک دن اس کا نغمہ اپنی ہی گونج میں کھو کے رہ گیا۔ اس نے آس پاس دیکھا، سوا اس کی پروازِ خیال کے ساتھ ذرا بھی اُڑان دکھا سکتا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی تعریفیں کتنی کھوکھلی، اس کے نغمے کتنے بے روح اور اس کی آواز کتنی بے سوز ہو کے رہ گئی۔ آخر اس کی مدح سرائی کا طلسم بھی ٹوٹنے لگا اور وہ دربار سے بھاگ نکلا۔

اس نے پھر سننے والے تلاش کرنے شروع کیے لوگ جمع کیے اور محفلیں جمائیں۔ مگر اب کوئی اسے پہچانتا نہیں تھا۔ اس اس کے منبع و

ماخذ سے آشنائی نہیں رکھتا تھا۔لوگ واہ واہ کرتے تھے۔سبحان اللہ کے ڈونگرے برساتے تھے،مگر وہ لرزشیں اور وہ دھڑکنیں کہاں تھیں؟ آواز و سامعہ کے وہ پُرانے عہد و پیماں کہاں تھے؟ چشم و گوش کی وہ آشتی کہاں تھی؟ اب تو لوگ اس کا وطن پوچھتے تھے،اس کا مذاق اُڑاتے تھے۔آخر تحسین ناشناس نے اسے خود پسند و خودنگر بنا دیا۔اب وہ لوگوں سے بھاگتا تھا۔ان کی داد و تحسین پہ جھلاتا تھا۔لعل و گہر اُگلنے کے بعد کچھ بلبلے بطور انعام ملیں تو ان کی کیا بساط ہے؟ اب تو ممدوح کی مربیّانہ شفقت بھی اسے میسّر نہیں تھی۔وہ پرانی مصلحت کسی مقصد سے ہی سہی مگر خود اس کے لیے ایک حد تک آرام و سکون کا باعث تو بنتی تھی،روحانی کوفت کے باوجود پہلے جسمانی آسائش کے تو سارے سامان مہیا تھے۔ زمانے کی قدر ناشناسی سننے والوں کی بے اعتنائی کو دیکھ کر اس نے بھی روپ بدلا اور چیخنا چلّانا شروع کر دیا۔تاکہ لوگ راغب ہوں۔اس کی فریادوں میں بدلتی دنیا کا الم بھی شامل تھا اور اس کا اپنا المیہ بھی جا بجا نمایاں ہو رہا تھا۔

بدلتی ہوئی دنیا کا عکس اور شاعری میں شاعر کا فرار ایک بہانہ تھا جو روحِ عصر اپنے اظہار کے لیے ڈھونڈ رہی تھی۔نالہ گویا گردشِ سیّارہ کی آواز ہے! وہ آسمان و زمین کے بگڑتے ہوئے رنگ روپ اپنی آواز میں سمو کے کہہ رہا تھا: دیکھو! اور سننے والے اپنی اپنی حدوں میں محبوس اس کی آواز کو سُن سُن کے ڈرے جا رہے تھے۔شاعر نے اس باولے کا بھیس بنا رکھا تھا جو ہر گاؤں کے گرداگرد چکّر کاٹتا ہے۔اور آنے والے حادثوں کی خبر دیتا ہے سب جانتے ہیں کہ یہ پگلا گاؤں سے کتنا پیار کرتا ہے اور گاؤں والوں کے دُکھ میں کس محبت سے اشک فشانی کرتا ہے۔مگر اس کے باوجود اس پگلے کی پیغمبری ایک بڑا ناگوار اور دلدوز فریضہ ہے جس کو ادا کرنا کسی محفل پرست، دنیادار اور مصلحت آشنا سخن ساز کے بس کی بات نہیں:

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

شعر کی ماہیت پہ سوچنے والے عموماً شاعر کو بھول جاتے ہیں۔اس شاعر کو جو بھیس بدل بدل کر ہر زمانے میں نئے جلوے اپنے ساتھ لے کر آتا رہا ہے۔ہمارے زمانے کا شاعر کسی اعتبار سے اکیلا ہے۔شعر پڑھنے والے ہیں تو شاعری کے بارے میں سوچنے والے اس کے ساتھ نہ چل سکتے ہیں نہ چلنا چاہتے ہیں کہنے والے کی آزمائش اس سے بڑی کیا ہوگی کہ باوجود ان حد بندیوں اور فاصلوں کے اس کی فریادیں دیواریں چیر کے کانوں تک پہنچتی ہیں یا نہیں۔اس دورِ ابتلا میں نار آفرینی محض ایک دیوانے کی پکار ہی نہیں،کئی دلوں کی دھڑکنیں اس کی ہم ساز و ہم نوا ہو سکتی ہیں اگر مصلحت آشنا ذہن ان دھڑکنوں کو ملفوف نہ کر دے۔آج کا شاعر نگری نگری گھومنے والے شاعر اور درباری سخن ساز دونوں کے مختلف مزاجوں کو ملا کے ایک نئی آواز پیدا کرنا چاہتا ہے،جو اس کے اپنے گرد و پیش اور اس کے اپنے آسمان و زمین سے بھی علاقہ رکھتی ہو۔طباعت کی مدد سے چشم و گوش تک پہنچنے والا پرانے نغمہ پیرا کی بے ساختگی کو سخن ساز کی مہارتِ فن سے اس طرح باہم پیوستہ کرنا چاہتا ہے کہ دونوں یک جان ہو جائیں۔اسی طرح اس کی آواز میں ایک ٹھہراؤ، گرفت اور قوت و تیزی کا اجتماع ہوگا۔اگر وہ اس شک و شبہ میں ڈوب جائے کہ اس کی آواز کہیں خلاؤں میں کھو کے رہ جائے گی تو شاید اسے بلند کرنے کا ہی کوئی جواز نہ رہ جائے۔

نالہ آفرینی جبر و اختیار کا ایک انوکھا کرشمہ ہے۔ قاری کے دل میں جگہ پانا بھی محض اس کے بس کی بات نہیں۔ آواز قوی ہو تو دور دور پہنچ جاتی ہے، نحیف ہو تو حلق سے باہر ہی نہیں نکلنے پاتی، صرف پہنچنے کی بات نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ ایک آواز ہزاروں کی آواز بن بھی سکتی ہے یا نہیں۔ محض ہزاروں کا ذکر کرنے یا ہزاروں کا مخاطب کرنے سے ان کی دھڑکنیں اور لرزشیں ساز ہم نوائی نہیں کر سکتیں۔

نالہ محفلیں برہم نہیں کرتا۔ نالہ آفریں پہ جو کچھ بھی گزری ہو اس کی فریدو فن کے سانچے میں ڈھل کر نغمہ نہیں بن سکتی تو محض چیخ پکار ہے۔

لاہور

پہلا دن ۱۹۵۴ء

ناصر کاظمی

حرفِ مکرّر

محفلِ مشاعرہ میں جب شاعر سے شعر پڑھنے کی دوبارہ فرمائش کی جاتی ہے تو وہ اسے مکرّر سُنا دیتا ہے۔ مگر جب پوری کتاب کے بارے میں پڑھنے والوں کا تقاضا مکرّر ہو تو صورت کچھ مختلف ہو جاتی ہے۔ اس خیال سے نئے ایڈیشن میں چند تازہ غزلیں اور اشعار شامل کر دیے ہیں کہ کتاب کا مجموعی تاثر تازہ تر ہا جائے۔

برگِ نے، جب پہلی مرتبہ شائع ہُوئی تو یہ میرا شوقِ فضول تھا۔ اب میرے پڑھنے والوں کی محبت ہے کہ اسے دوسری مرتبہ پیش کر رہا ہوں۔

اگست ۱۹۵۷ء

ناصر کاظمی

غزل

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

اے دل کسے نصیب یہ توفیق اضطراب
ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی

تیرے کرم سے اے اَلَمِ حُسن آفریں
دل بن گیا ہے دوست کی خلوت کبھی کبھی

جوشِ جنون میں درد کی طغیانیوں کے ساتھ
اشکوں میں ڈھل گئی تری صورت کبھی کبھی

تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا
گذری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی

کبھی اپنا ہوش تھا نہ تمھارا خیال تھا
یوں بھی گزر گئی شبِ فرقت کبھی کبھی

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی



محروم خواب دیدۂ حیراں نہ تھا
تیرا یہ رنگ اے شبِ ہجراں نہ تھا کبھی

تھا لطفِ وصل اور کبھی افسوانِ انتظار
یوں دردِ ہجر سا سلہ جنباں نہ تھا کبھی

پُرساں نہ تھا کوئی تو یہ رسوائیاں نہ تھیں
ظاہر کسی پہ حالِ پریشاں نہ تھا کبھی

ہر چند غم بھی تھا مگر احساسِ غم نہ تھا
درمان نہ تھا تو ماتمِ درماں نہ تھا کبھی

دن بھی اُداس اور مِری رات بھی اُداس
ایسا تو وقت اے غمِ دوراں نہ تھا کبھی

دورِ خزاں میں یوں مرے دل کو قرار ہے
میں جیسے آشنائے بہاراں نہ تھا کبھی

کیا دن تھے جب نظر میں خزاں بھی بہار تھی
یوں اپنا گھر بہار میں ویراں نہ تھا کبھی

بے کیف و بے نشاط نہ تھی اس قدر حیات
جینا اگرچہ عشق میں آساں نہ تھا کبھی



کیا دن مجھے عشق نے دکھائے
اِک بار جو آئے پھر نہ آئے

اُس پیکرِ ناز کا فسانہ
دل ہوش میں آئے تو سُنائے

وہ روح خیال و جانِ مضمون
دل اُس کو کہاں سے ڈھونڈ لائے

آنکھیں تھیں کہ دو چھلکتے ساغر
عارض کہ شراب تھرتھرائے

مہکی ہُوئی سانس نرم گفتار
ہر ایک روش پہ گُل کھلائے

راہوں پہ ادا ادا سے رقصاں
آنچل میں حیا سے منہ چھپائے

اُڑتی ہُوئی زلف یوں پریشاں
جیسے کوئی راہ بُھول جائے

کچھ پُھول برس پڑے زمیں پر
کچھ گیت ہوا میں لہلہائے



ما یوس نہ ہو اُداس راہی
پھر آئے گا دورِ صبحگاہی

اے منتظرِ طلوعِ فروا
بدلے گا جہانِ مرغ و ماہی

پھر خاک نشیں اُٹھائیں گے سر
مٹنے کو ہے نازِ کجکلاہی

انصاف کا دن قریب تر ہے
پھر داد طلب ہے بیگناہی

پھر اہلِ وفا کا دور ہو گا
ٹوٹے گا طلسمِ کم نگاہی

آئین جہاں بدل رہا ہے
بدلیں گے اوامر و نواہی



رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ
لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ

اب کی فصلِ بہار سے پہلے
رنگ تھے گلستاں میں کیا کیا کچھ

کیا کہوں اب تمہیں خزاں والو!
جل گیا آشیاں میں کیا کیسا کچھ

دل ترے بعد سو گیا ورنہ
شور تھا اس مکاں میں کیا کیا کچھ



ختم ہُوا تاروں کا راگ
جاگ مسافر اب تو جاگ

دھوپ کی جلتی تانوں سے
دشتِ فلک میں لگ گئی آگ

دن کا سنہرا نغمہ سُن کر
ابلقِ شبن نے موڑ ہی باگ

کلیاں مجھلی جاتی ہیں
سورج پھینک رہا ہے آگ

یہ نگری اندھیاری ہے
اس نگری سے جلدی بھاگ



او میرے مصرف خدا
اپنی دنیا دیکھ ذرا

اتنی خلقت کے ہوتے
شہروں میں ہے سناٹا

جھونپڑی والوں کی تقدیر
بجھا بجھا سا ایک دریا

خاک اُڑارے ہیں دن رات
میلوں پھیل گئے صحرا

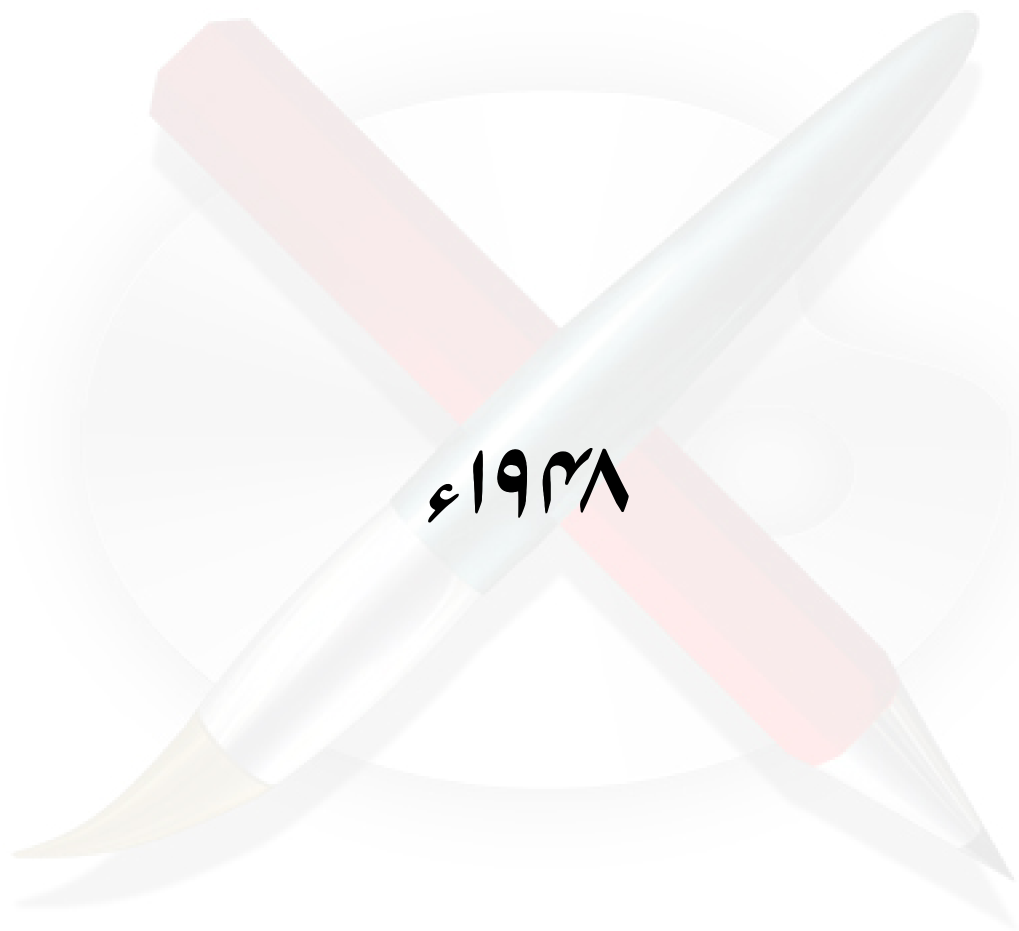
زاغ و زغن کی چیخوں سے
سُونا جنگل گونج اُٹھا

سورج سر پر آپہنچا
گرمی ہے یا روزِ جزا

پیاسی دھرتی جلتی ہے
سُوکھ گئے بہتے دریا

فصلیں جل کر راکھ ہوئیں
نگری نگری کال پڑا

او میرے مصروف خدا
اپنی دنیا دیکھ ذرا



۱۹۴۸ء



حاصلِ عشق ترا حُسنِ پشیماں ہی سہی
میری حسرت تری صورت سے نمایاں ہی سہی

حُسن بھی حُسن ہے محتاجِ نظر ہے جب تک
شعلۂ عشق چراغِ تہِ داماں ہی سہی

کیا خبر خاک ہی سے کوئی کرن پُھوٹ پڑے
ذوقِ آوارگیٔ دشت و بیاباں ہی سہی

پردۂ گُل ہی سے شاید کوئی آواز آئے
فرصتِ سیرو تماشائے بہاراں ہی سہی



ترے ملنے کو بیکل ہو گئے ہیں
مگر یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں

بہاریں لے کے آئے تھے جہاں تم
وہ گھر سنسان جنگل ہو گئے ہیں

یہاں تک بڑھ گئے آلامِ ہستی
کہ دل کے حوصلے شل ہو گئے ہیں

کہاں تک تاب لائے نا تواں دل
کہ صدمے اب مسلسل ہو گئے ہیں

نگاہِ یاس کو نیند آ رہی ہے
مژہ پر اشک بوجھل ہو گئے ہیں

انھیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ
یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں

جنہیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں



کچھ کہہ کے خموش ہو گئے ہم
قصّہ تھا دراز کھو گئے ہم

تو کون ہے تیرا نام کیا ہے
کیا سچ ہے کہ تیرے ہو گئے ہم

زلفوں کے دھیان میں لگی آنکھ
پر کیف ہوا میں سو گئے ہم



گرفتہ دل ہیں بہت آج رہتے دیوانے
خدا کرے کوئی تیرے سوا نہ پہچانے

مٹی مٹی سی امیدیں تھکے تھکے سے خیال
بجھے بجھے سے نگا ہوں میں غم کے افسانے

ہزار شُکر کہ ہم نے زبان سے کچھ نہ کہا
یہ اور بات کہ پُوچھا نہ اہلِ دنیا ئے

بقدرِ تشنہ لبی پرسشِ وفا نہ ہُوئی
چھلک کے رہ گئے تیری نظر کے پیمانے

خیال آگیا مایوں رہگزاروں کا
پلٹ کے آگئے منزل سے تیرے دیوانے

کہاں ہے تو کہ ترے انتظار میں اے دوست
تمام رات سُلگتے ہیں دل کے ویرانے

اُمید پرسشِ غم کس سے کیجیے ناصؔر
جو اپنے دل پر گزرتی ہے کوئی کیا جانے



عشق میں جیت ہُوئی یا مات
آج کی رات نہ چھیڑ یہ بات

یوں آیا وہ جانِ بہار
جیسے جگ میں پھیلے بات

رنگ کُھلے صحرا کی دھوپ
زلف گھنے جنگل کی رات

کچھ نہ سُنا اور کچھ نہ کہا
دل میں رہ گئی دل کی بات

یار کی نگری کوسوں دُور
کیسے کٹے گی بھاری رات

بستی والوں سے چُھپ کر
رو لیتے ہیں پچھلی رات

سنّاٹوں میں سنتے ہیں
سُنی سنائی کوئی بات

پھر جاڑے کی رُت آئی
چھوٹے دن اور لمبی رات



دیکھ محبت کا دستور
تُو مجھ سے میں تجھ سے دُور

تنہا تنہا پھرتے ہیں
دل ویراں آنکھیں بے نُور

دوست بچھڑتے جاتے ہیں
شوق لیے جاتا ہے دُور

ہم اپنا غم بھول گئے
آج کسے دیکھا مجبُور

دل کی دھڑکن کہتی ہے
آج کوئی آئے گا ضرور

کوشش لازم ہے پیارے
آگے جو اُس کو منظور

سورج ڈوب چلا ناصؔر
اور ابھی منزل ہے دُور



نہ آنکھیں ہی برسیں نہ تم ہی ملے
بہاروں میں ابکی نئے گُل کِھلے

نہ جانے کہاں لے گئے قافلہ
مسافر بڑی دور جا کر ملے

وہی وقت کی قید ہے درمیاں
وہی منزلیں اور وہی فاصلے

جہاں کوئی بستی نظر آگئی
وہیں رُک گئے اجنبی قافلے

تمہیں دل گرفتہ نہیں دوستو
ہمیں بھی زمانے سے ہیں کچھ گِلے

ہمیں بھی کریں یاد اہلِ چمن
چمن میں اگر کوئی غنچہ کِھلے

ابھی اور کِتنی ہے میعادِ غم
کہاں تک ملیں گے وفا کے صلے



پہنچے گور کنارے ہم
بس غمِ دوراں ہارے ہم

سب کچھ ہار کے رستے میں
بیٹھ گئے دکھیارے ہم

ہر منزل سے گزرے ہیں
تیرے غم کے سہارے ہم

دیکھ خیالِ خاطر دوست
بازی جیت کے ہارے ہم

آنکھ کا تارا آنکھ میں ہے
اب نہ گِنیں گے تارے ہم



شہر در شہر گھر جلائے گئے
یو ں بھی جشنِ طرب منائے گئے

اک طرف جھو م کر بہار آئی
اک طرف آشیاں جلائے گئے

اک طرف خون دل بھی تھا نایاب
اک طرف جشنِ جم منائے گئے

کیا کہوں کس طرح سرِ بازار
عِصمتوں کے دیئے بجھائے گئے

آہ وہ خلوتوں کے سرمائے
مجمعِ عام میں لٹائے گئے

وقت کے ساتھ ہم بھی اے ناصرؔ
خار و خس کی طرح بہائے گئے



وہ دلنواز ہے لیکن نظر شناس نہیں
مرا علاج مرے چارہ گر کے پاس نہیں

تڑپ رہے ہیں زباں پر کئی سوال مگر
مرے لیے کوئی شایانِ التماس نہیں

ترے جلو میں بھی دل کانپ کانپ اُٹھتا ہے
مرے مزاج کو آسودگی بھی راس نہیں

کبھی کبھی جو ترے قرب میں گزارے تھے
اب اُن دنوں کا تصور بھی میرے پاس نہیں

گزر رہے ہیں عجب مرحلوں سے دیدہ و دل
سحر کی آس تو ہے زندگی کی آس نہیں

مجھے یہ ڈر ہے تری آرزو نہ مٹ جائے
بہت دنوں سے طبیعت مری اُداس نہیں



یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پُھول کِھلے ہیں منہ اندھیرے

شعلے میں ہے ایک رنگ تیرا
باقی ہیں تمام رنگ میرے

آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں
یادوں کے بجھے ہُوئے سویرے

دیتے ہیں سُراغ فصلِ گُل کا
شاخوں پہ جلے ہُوئے بسیرے

منزل نہ ملی تو قافلوں نے
رستے میں جما لیے ہیں ڈیرے

جنگل میں ہُوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

رودادِ سفر نہ چھیڑنا ناصؔر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے



۱۹۴۹ء



دِن پھر آئے ہیں باغ میں گُل کے
بُوئے گُل ہے سُراغ میں گُل کے

دلِ ویراں میں دوستوں کی یاد
جیسے جگنو ہوں داغ میں گُل کے

کیسی آئی بہار اب کے برس
بُوئے خوں ہے ایا غ میں گُل کے

اب تو رستوں میں خاک اُڑاتی ہے
سب کر شمے تھے با غ میں گُل کے

آنسوؤں کے دیئے جلا ناصرؔ
دم نہیں اب چراغ میں گُل کے



کوئی جیے یا مرے
تم اپنی سی کر گزرے

دل میں تیری یادوں نے
کیسے کیسے رنگ بھرے

اب وہ اُمنگیں ہیں نہ وہ دل
کون اب تجھ کو یاد کرے

پیار کی ریت نرالی ہے
کوئی کرے اور کوئی پھرے

پُھول تو کیا کانٹے بھی نہیں
کیسے اُجڑتے باغ ہرے

بادل گرجا پون چلی
پھلواری میں پُھول ڈرے

پت جھڑ آنے والی ہے
رَس پی کر اُڑ جا بھنو نرے

☆

یہ بھی کیا شام ملاقات آئی
لب پہ مشکل سے تری بات آئی

صبح سے چپ ہیں ترے ہجر نصیب
ہائے کیا ہو گا اگر رات آئی

بستیاں چھوڑ کر برسے بادل
کس قیامت کی یہ برسات آئی

کوئی جب مل کے ہوا تھا رخصت
دلِ بے تاب وہی رات آئی

سایہ زُلفِ بتاں میں ناصرؔ
ایک سے ایک نئی رات آئی



نازِ بیگانگی میں کیا کچھ تھا
حسن کی سادگی میں کیا کچھ تھا

لاکھ راہیں تھیں لاکھ جلوے تھے
عہدِ آوارگی میں کیسا کچھ تھا

آنکھ کھلتے ہی چھپ گئی ہر شے
عالمِ بےخودی میں کیا کچھ تھا

یاد ہیں مرحلے محبت کے
ہائے اُس بیکلی میں کیا کچھ تھا

کتنے بیتے دنوں کی یاد آئی
آج تیری کمی میں کیا کچھ تھا

کتنے ما نوس لو گ یا د آئے
صبح کی چاند نی میں کیا کچھ تھا

رات بھر ہم نہ ہو سکے نا صرؔ
پر دۂ کامشی میں کیا کچھ تھا



کسے دیکھیں کہاں دیکھا نہ جائے
وہ دیکھا ہے جہاں دیکھا نہ جائے

مری بر با دیوں پر رونے والے
تجھے محوِ فغاں دیکھا نہ جائے

زمیں لو گوں سے خالی ہو رہی ہے
یہ رنگِ آسماں دیکھا نہ جا ئے

سفر ہے اور غربت کا سفر ہے
غمِ صد کا رواں دیکھا نہ جا ئے

کہیں آگ اور کہیں لاشوں کے انبار
بس اے دورِ زماں دیکھا نہ جائے

درد دیوار ویراں شمع مدھم
شبِ غم کا سماں دیکھا نہ جائے

پرانی صحبتیں یاد آرہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

بھری برسات خالی جا رہی ہے
سر ابر رواں دیکھا نہ جائے

کہیں تم اور کہیں ہم کیا غضب ہے
فراق جسم و جاں دیکھا نہ جائے

وہی جو حاصلِ ہستی ہے ناصرؔ
اُسی کو مہرباں دیکھا نہ جائے



صدائے رفتگاں پھر دل سے گزری
نگاہِ شوق کس منزل سے گزری

کبھی روئے کبھی تجھکو پُکارا
شبِ فرقت بڑی مشکل سے گزری

ہوائے صبح نے چونکا دیا یوں
تری آواز جیسے دل سے گزری

مرا دل خو گرِ طوفاں ہے ورنہ
یہ کشتی بارہا ساحل سے گزری



گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلّی اب کے ایسی اُجڑی گھر گھر پھیلا سوگ

سارا سارا دن گلیوں میں پھرتے ہیں بے کار
راتوں اُٹھ اُٹھ کر روتے ہیں اس نگری کے لوگ

سہمے سہمے سے بیٹھے ہیں راگی اور فنکار
بھور بھئے اب ان گلیوں میں کون سُنائے جوگ

جب تک ہم مصروف رہے یہ دنیا تھی سنسان
دن ڈھلتے ہی دھیان میں آئے کیسے کیسے لوگ

ناصؔر ہم کو رات ملا تھا تنہا اور اُداس
وہی پرانی باتیں اُس کی وہی پُرانا روگ

☆

خموش اُنگلیاں چٹخا رہی ہے
تری آواز اب تک آرہی ہے

دلِ وحشی لیے جاتا ہے لیکن
ہوا زنجیر سے پہنا رہی ہے

ترے شہرِ طرب کی رونقوں میں
طبعیت اور بھی گھبرا رہی ہے

کرم اے صر صرِ آلام دوراں
دلوں کی آگ بجھتی جارہی ہے

کڑے کوسوں کے سناٹے ہیں لیکن
تری آواز اب تک آرہی ہے

طناب خیمۂ گُل تھام ناصر
کو ئی آندھی اُفق سے آرہی ہے



کم فرصتی خواب ِ طرب یاد رہے گی
گزری جو ترے ساتے وہ شب یار رہے گی

ہر چند ترا عہد وفا بھول گئے ہم
وہ کشمکشِ صبر طلب یاد رہے گی

سینے میں امنگوں کا وہی شور ہے اب تک
وہ شوخئی یکب خبش لب یار رہے گی

پھر جس کے تصور میں لگیں آنکھیں
وہ برہنی صحبت شب یاد رہے گی

گو ہجر کے لمحات بہت تلخ تھے لیکن
ہر بات بعنوان ِ طرب یا د رہے گی



نصیب ِ عشق دلِ بے قرار بھی تو نہیں
بہت دنوں سے ترا انتظار بھی تو نہیں

تلافی ستمستمِ روزگار کون کرے
تو ہم سخن بھی نہیں راز دار بھی تو نہیں

زمانہ پُرسشِ غم بھی کرے تو کیا حاصل
کہ تیرا غم غمِ لیل و نہار بھی تو نہیں

تری نگاہِ تغافل کو کون سمجھائے
کہ اپنے دل پہ مجھے اختیار بھی تو نہیں

تو ہی بتا کہ تری خامشی کو کیا سمجھوں
تری نگاہ سے کچھ آشکار بھی تو نہیں

وفا نہیں نہ سہی رسم وراہ کیا کم ہے
تری نظر کا مگر اعتبار بھی تو نہیں

اگرچہ دل تری منزل نہ بن سکا اے دوست
مگر چراغِ سرِ رہگزار بھی تو نہیں

بہت فسردہ ہے دل، کون اس کو بہلائے
اُداس بھی تو نہیں بے قرار بھی نہیں

تو ہی بتا ترے بے خانماں کدھر جائیں
کہ راہ میں شجرِ سایہ دار بھی تو نہیں

فلک نے پھینک دیا برگِ گُل کی چھاؤں سے دُور
وہاں پڑے ہیں جہاں خارزار بھی تو نہیں

جو زندگی ہے تو بس تیرے درد مندوں کی
یہ جبر بھی نہیں اختیار بھی نہیں

وفا ذریعہ اظہار ِ غم سہی ناصؔر
یہ کاروبار کوئی کاروبار بھی تو نہیں

۱۹۵۰ء



دورِ فلک جب دُہراتا ہے موسمِ گُل کی راتوں کو
کنجِ قفس میں سُن لیتے ہیں بُھولی بِسری باتوں کو

ریگِ رواں کی نرم تہوں کو چھیڑتی ہے جب کوئی ہوا
سُونے صحرا چیخ اُٹھتے ہی آدمی راتوں کو

آتشِ غم کے سیلِ رواں میں نیندیں جل کر راکھ ہُوئیں
پتّھر بن کر دیکھ رہا ہوں آتی جاتی راتوں کو

میخانے کا افسردہ ماحول تو یونہی رہنا ہے
خشک لبوں کی خیر مناؤ کچھ نہ کہو برساتوں کو

ناصؔر میرے منہ کی باتیں یوں تو سچّے موتی ہیں
لیکن اُن کی باتیں سُن کر بھول گئے سب باتوں کو



سفرِ منزلِ شب یاد نہیں
لوگ رخصت ہُوئے کب یاد نہیں

اوّلیں قُرب کی سرشاری میں
کتنے ارماں تھے جواب یاد نہیں

دل میں ہر وقت چبھن رہتی تھی
تھی مجھے کس کی طلب یاد نہیں

وہ ستارا تھی کہ شبنم تھی کہ پھول
ایک صورت تھی عجب یاد نہیں

کیسی ویراں ہے گزر گاہِ خیال
جب سے وہ عارض و لب یاد نہیں

بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار
یاد آئیں بھی تو سب یاد نہیں

ایسا اُلجھا ہوا غم دنیا میں
ایک بھی خوابِ طرب یاد نہیں

رشتہ جاں تھا کبھی جس کا خیال
اُس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

یہ حقیقت ہے کہ احباب کو ہم
یاد ہی کب تھے جو اب یاد نہیں

یاد ہے سیر چراغاں ناصرؔ
دل کے بجھنے کا سبب یاد نہیں



یاد آتا ہے روز و شب کا ئی
ہم سے رو ٹھا ہے بے سبب کو ئی

لبِ جُو چھا ؤں میں درختوں کی
وہ ملا قات تھی عجب کو ئی

جب تجھے پہلی بار دیکھا تھا
وہ بھی تھا مو سمِ طرب کوئی

کچھ خبر لے کر تیری محفل سے
دُور بیٹھا ہے جاں بلب کو ئی

نہ غمِ زند گی نہ دردِ فراق
دل میں یو نہی سہی ہے طلب کو ئی

یا د آتی ہیں دُور کی باتیں
پیار سے دیکھتا ہے جب کوئی

چو ٹ کھا ئی ہے بارہا لیکن
آج تو درد ہے عجب کو ئی

جن کو مٹنا تھا مٹ چکے نا صرؔ
اُن کو رسوا کرے نہ اب کوئی



یاس میں جب کبھی آنسو نکلا
اک نئی آس کا پہلو نکلا

لے اُڑی سبزۂ خود رو کی مہک
پھر تری یاد کا پہلو نکلا

میٹھی بو لی میں پپیہے بو لے
گنگنا تا ہُوا جب تو نِکلا

آئیں سا ون کی اند ھیری راتیں
کہیں تارا کہیں جگنو نکلا

نئے مضمون سجھا تی ہے صبا
کیا ادھر سے وہ سمن بُو نِکلا

پاؤں چلنے لگی جلتی ہُوئی ریت
دشت سے جب کوئی آہو نکلا

کئی دن رات سفر میں گزرے
آج تو چاند لبِ جُو نکلا

طاقِ میخانہ میں چاہی تھی اماں
وہ بھی تیرا خمِ ابرو نکلا[

اہلِ دل سیرِ چمن سے بھی گئے
عکس ِ گُل سا ئیہ گیسو نکلا

وا قعہ یہ ہے کہ بد نام ہُوئے
بات اتنی تھی کہ آنسو نکلا



کرتا اُسے بے قرار کچھ دیر
ہوتا اگر اختیار کچھ دیر

کیا روئیں فریبِ آسماں کو
اپنا نہیں اعتبار کچھ دیر

آنکھوں میں کٹی پہاڑ سی رات
سوجا دلِ بے قرار کچھ دیر

اے شہرِ طرب کو جانے والو
کرنا مرا انتظار کچھ دیر

سر مستئ روز و شب مسلسل
سر مستئ انتظار کچھ دیر

تکلیفِ غمِ فراق دائم
تقریبِ وصالِ یار کچھ دیر

یہ غنچہ و گُل ہیں سب مسافر
ہے قافلۂ بہار کچھ دیر

دنیا تو سدا رہے گی ناصؔر
ہم لوگ ہیں یادگار کچھ دیر



ٹھہرا تھا وہ گُلعذار کچھ دیر
بھر پُور رہی بہار کچھ دیر

اک دُھوم رہی گلی گلی میں
آباد رہے دیار کچھ دیر

پھر جُھوم کے بستیوں پہ برسا
ابرِ سرِ کوہسار کچھ دیر

پھر لالہ و گُل کے میکدوں میں
چھلکی مئے مشکبار کچھ دیر

پھر نغمہ وے کی صحبتوں کا
آنکھوں میں رہا خمار کچھ دیر

پھر شامِ وصالِ یار آئی
بہلا غمِ روز گار کچھ دیر

پھر جاگ اُٹھے خوشی کے آنسو
پھر دل کو مِلا قرار کچھ دیر

پھر ایک نشا طِ بے خودی میں
آنکھیں رہیں اشکبا رکچھ دیر

پھر ایک طویل ہجر کے بعد
صحبت رہی خوشگوار کچھ دیر

پھر ایک نگاہ کے سہارے
دنیا رہی ساز گار کچھ دیر



اوّلیں چاند نے کیا بت سجھائی مجھ کو
یاد آئی تری انگشتِ حنائی مجھ کو

سرِایوان طرب نغمہ سرا تھا کوئی
رات بھر اُس نے تری یاد دلائی مجھ کو

دیکھتے دیکھتے تاروں کا سفر ختم ہُوا
سو گیا چاند مگر نیند نہ آئی مجھ کو

اِنھی آنکھوں نے شبِ ہجر دکھائی مجھ کو

سائے کی طرح مرتے ساتھ رہے رنج و اَلم
گردشِ وقت کہیں شاس نہ آئی مجھ کو

دھوپ اُدھر ڈھلتی تھی دل ڈوبتا جاتا تھا اِدھر
آج تک یاد ہے وہ شامِ جدائی مجھ کو

شہرِ لاہور تری رونقیں دائم آباد
تیری گلیوں کی ہَوا کھینچ کے لائی مجھ کو



کبھی کبھی تو جذبِ عشق مات کھا کے رہ گیا
کہ تجھ سے مل کے بھی ترا خیال آکے رہ گیا

جدائیوں کے مرحلے بھی حُسن سے تہی نہ تھے
کبھی کبھی تو شوق آئنے دکھا کے رہ گیا

کسے خبر کہ عشق پر قیامتیں گزر گئیں
زمانہ اُس نگاہ کا فریب کھا کے رہ گیا

یہ کیا مقامِ شوق ہے نہ آس ہے نہ یاس ہے
یہ کیا ہُوا کہ لب پہ تیرا نام آکے رہ گیا

کوئی بھی ہم سفر نہ تھا شریکِ منزلِ جنوں
بہت ہُوا تو رفتگاں کا دھیان آگے رہ گیا

چراغِ شامِ آرزو بھی جھلملا کے رہ گئے
ترا خیال راستے سجھا سجھا کے رہ گیا

چمک چمک کے رہ گئیں نجوم و گل کی منزلیں
میں درد کی کہانیاں سُنا سُنا کے رہ گیا

ترے وصال کی اُمید اشک بن کے بہہ گئی
خوشی کا چاند شام ہی سے جھلملا کے رہ گیا

وہی اُداس روز و شب ، وہی فسوں ، وہی ہوا
ترے وصال کا زمانہ یاد آکے رہ گیا



رنگ برسات نے بھرے کچھ تو
زخم دل کے ہُوئے ہرے کچھ تو

فرصتِ بے خودی غنیمت ہے
گردشیں ہو گئیں پَرے کچھ تو

کتنے شوریدہ سر تھے پروا نے
شام ہوتے ہی جل مرے کچھ تو

ایسا مشکل نہیں ترا ملنا
دل مگر جستجو کرے کچھ تو

آؤ ناصرؔ کوئی غزل چھیڑیں
جی بہل جائے گا ارے کچھ تو



دن ڈھلا رات پھر آگئی سو رہو سو رہو
منزلوں چھو گئی خامشی سو رہو سو رہو

سارا دن تپتے سورج کی گرمی میں جلتے رہے
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پھر چلی سو رہو سو رہو

گرم سنسان قریوں کی دھرتی مہکنے لگی
خاک رشکِ ارم بن گئی سو رہو سو رہو

رزم گاہِ جہاں بن گئی جائے امن و اماں
ہے یہی وقت کی راگنی سو رہو سو رہو

کیسے سنسان ہیں آسماں چُپ کھڑے ہیں مکاں
ہے فضا اجنبی اجنبی سو رہو سو رہو

تھک گئے ناقہ و ساربان تھم گئے کارواں
گھنٹیوں کی صدا سو گئی سو رہو سو رہو

چاندنی اور دھوئیں کے سوا دور تک کچھ نہیں
سو گئی شہر کی ہر گلی سو رہو سو رہو

گردشِ وقت کی لوریاں رات کی رات ہیں
پھر کہاں یہ ہوا یہ نمی سو رہو سو رہو

ساری بستی کے لوگ اس مدھرلے میں کھوئے گئے
دُور بجنے لگی بانسری سو رہو سو رہو

دُور شاخوں کی جُھرمٹ میں جگنو بھی گُم ہو گئے
چاند میں سو گئی چاندنی سو رہو سو رہو

گھر کے دیوار و دَر راہ تک تک کے شل ہو گئے
اب نہ آئے گا شاید کوئی سو رہو سو رہو

سُست رفتار تارے بھی آنکھیں جھپکنے لگے
غم کے مارو گھڑی دو گھڑی سو رہو سو رہو

منہ اندھیرے ہی ناصر کسے ڈھونڈنے چل دیے
دُور ہے صبحِ روشن ابھی سو رہو سو رہو

☆

تنہا عیش کے خواب نہ بُن
کبھی ہماری بات بھی سُن

تھوڑا غم بھی اُٹھا پیارے
پُھول چنے ہیں خار بھی چُن

سکھ کی نیند یں سو نے والے
محرومی کے راگ بھی سُن

ق

تنہا ئی میں تیری یاد
جیسے ایک سُریلی دُھن

جیسے چاند کی ٹھنڈی لَو
جیسے کر نوں کی کُن مُن

جیسے جل پر یوں کا ناچ
جیسے پا ئل کی جُھن جُھن

☆

مرے خیال سے لَو دے اُٹھی ہے تنہا ئی
شبِ فراق ہے یا تیری جلوہ آرائی

تو کس خیا ل میں ہے منزلوں کے شید ائی
اُنھیں بھی دیکھ جنھیں راستے میں نیند آئی

پکار اے جر سِ کا روان ِ صبحِ طرب
بھٹک رہے ہیں اند ھیروں میں تیرے سو دائی

ٹھر گئے ہیں سرِ راہ خاک اُڑانے کو
مسافروں کو نہ چھیڑ اے ہوائے صحرائی

رہِ حیات میں کچھ مرحلے تو دیکھ لیے
یہ اور بات تری آرزو نہ راس آئی

یہ سانحہ بھی محبت میں بارہا گزرا
کہ اُس نے حال بھی پوچھا تو آنکھ بھر آئی

دلِ فسردہ میں پھر دھڑکنوں کا شور اُٹھا
یہ بیٹھے بیٹھے مجھے کن دنوں کی یاد آئی

میں سوتے سوتے کئی بار چونک چونک پڑا
تمام رات ترے پہلوؤں سے آنچ آئی

جہاں بھی تھا کوئی فتنہ تڑپ کے جاگ اُٹھا
تمام ہوش تھی مستی میں تیری انگڑائی

کُھلی جو آنکھ تو کچھ اور ہی سماں دیکھا
وہ لوگ تھے نہ وہ جلسے نہ شہرِ رعنائی

وہ تابِ درد وہ سودائے انتظار کہاں
اُنھی کے ساتھ گئی طاقتِ شکیبائی

پھر اُس کی یاد میں دل بے قرار ہے ناصرؔ
بچھڑ کے جس سے ہُوئی شہر شہر رسوائی

☆

اُداسیوں کا سماں محفلوں میں چھوڑ گئی
بہار ایک خلش سی دلوں میں چھوڑ گئی

بچھڑ کے تجھ سے ہزاروں طرف خیال گیا
تری نظر مجھے کن منزلوں میں چھوڑ گئی

کہاں سے لائیے اب اُس نگاہ کو ناصرؔ
جو ناتمام امنگیں دلوں میں چھوڑ گئی

☆

بسا ہُوا خیالوں میں کوئی پیکرِ ناز
بُلا رہی ہے ابھی تک وہ دلنشیں آواز

وہی دنوں میں تپش ہے وہی شبوں میں گداز
مگر یہ کیا کہ مری زندگی میں سوز نہ ساز

نہ چھیڑ اے خلشِ درد بار بار نہ چھیڑ
چھپائے بیٹھا ہوں سینے میں ایک عمر کے راز

بس اب تو ایک ہی دُھن ہے کہ نیند آ جائے
وہ دن کہاں کہ اُٹھائیں شبِ فراق کے ناز

گزر ہی جائے گی اے دوست تیرے ہجر کی رات
کہ تجھ سے بڑھ کے ترا درد ہے مرا دمساز

یہ اور بات کہ دنیا نہ سُن سکی ورنہ
سکوتِ اہلِ نظر ہے بجائے خود آواز

یہ بے سبب نہیں شام و سحر کے ہنگامے
اُٹھا رہا ہے کوئی پردہ ہائے راز و نیاز

ترا خیال بھی تیری طرح مکمّل ہے
وہی شباب ، وہی دلکشی ، وہی انداز

شراب و شعر کی دنیا بدل گئی لیکن
وہ آنکھ ڈھونڈ ہی لیتی ہے بیخودی کا جواز

عروج پر ہے مرا درد ان دنوں ناصرؔ
مری غزل میں دھڑکتی ہے وقت کی آواز



دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا
وہ تری یاد تھی اب یا د آیا

آج مشکل تھا سنبھلنا اے دوست
تو مصیبت میں عجب یاد آیا

دن گزار ا تھا بڑی مشکل سے
پھر ترا وعدۂ شب یاد آیا

تیرا بُھولا ہُوا پیمانِ وفا
مَر رہیں گے اگر اب یاد آیا

پھر لوگ نظر سے گزرے
پھر کوئی شہرِ طرب یاد آیا

حالِ دل ہم بھی سُنا تے لیکن
جب وہ رخصت ہُوا تب یاد آیا

بیٹھ کر سایہ گُل میں ناصرؔ
ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

۱۹۵۱ء



یہ کہہ رہا ہے دیارِ طرب کا نظارا
یہیں ملے گا مجھے میرا انجمن آرا

خیالِ حسن میں کتنا بہار پرور ہے
شبِ خزاں کی خنک چاندنی کا نظّارا

چلے تو ہیں جرسِ گُل کا آسرا لے کر
نہ جانے اب کہاں نکلے گا صبح کا تارا

چلو کہ برف پگھلنے کی صبح آپہنچی
خبر بہار کی لایا ہے کوئی گُل پارا

چلے چلو انھی گُمنام برف زاروں میں
عجب نہیں یہیں مل جائے درد کا چارا

کسے مجال کہ رُک جائے سانس لینے کو
رواں دواں لیے جاتا ہے وقت کا دھارا

بگُولے یوں اُڑائے پھرتے ہیں خشک جنگل میں
تلاشِ آب میں جیسے غزالِ آوارہ

ہمیں وہ برگِ خزاں دیدہ ہیں جنھیں ناصرؔ
چمن میں ڈھونڈتی پھرتی ہے بُوئے آوارہ



تیری زلفوں کے بکھرنے کا سبب ہے کوئی
آنکھ کہتی ہے ترے دل میں طلب ہے کوئی

آنچ آتی ہے ترے جسم کی عُریانی سے
پیرہن ہے کہ سلگتی ہُوئی شب ہے کوئی

ہوش اُڑانے لگیں پھر چاند کی ٹھنڈی کرنیں
تیری بستی میں ہوں یا خوابِ طرب ہے کوئی

گیت بُنتی ہے ترے شہر کی بھرپور ہوا
اجنبی میں ہی نہیں تو بھی عجب ہے کوئی

لیے جاتی ہیں کسی دھیان کی لہریں ناصرؔ
دُور تک سلسلۂ تاکِ طرب ہے کوئی



خیالِ ترکِ تمنا نہ کر سکے تو بھی
اُداسیوں کا مُداوا نہ کر سکے تو بھی

کبھی وہ وقت بھی آئے کہ کوئی لمحہ عیش
مرے بغیر گوارا نہ کر سکے تُو بھی

خدا وہ دن نہ دکھائے تجھے کہ میری طرح
مری وفا پہ بھروسا نہ کر سکے تُو بھی

میں اپنا عقدۂ دل تجھ کو سونپ دیتا ہوں
بڑا مزا ہو اگر وا نہ کر سکے تو بھی

تجھے یہ غم کہ مری زندگی کا کیا ہوگا
مجھے یہ ضد کہ مدا وا نہ کر سکے تُو بھی

نہ کر خیالِ تلافی کہ میرا زخمِ وفا
وہ زخم ہے جسے اچھا نہ کر سکے تُو بھی



یہ رات تمہاری ہے چمکتے رہو تارو
وہ آئیں نہ آئیں مگر اُمّید نہ ہارو

شاید کسی منزل سے کوئی قافلہ آئے
آشفتہ سرو صبح تلک یُونہی پکارو

دن بھر تو چلے اب ذرا دم لے کے چلیں گے
اے ہمسفرو آج یہیں رات گزارو

یہ عالَم وحشت ہے تو کچھ ہو ہی رہے گا
منزل نہ سہی سر کسی دیوار سے مارو

اوجھل ہُوئے جاتے ہیں نگاہوں سے دوعالم
تم آج کہاں ہوں غمِ فرقت کے سہا رو

کھو یا ہے اُسے جس کا بدل کوئی نہیں ہے
یہ بات مگر کون سُنے ،لاکھ پکا رو !



فکرِ تعمیرِ آشیاں بھی ہے
خوفِ بے مہر ئی خزاں بھی ہے

خاک بھی اُڑ رہی ہے رستوں میں
آمدِ صبح کا سماں بھی ہے

رنگ بھی اُڑ ہا ہے پُھولوں کا
غنچہ غنچہ شر رفشاں بھی ہے

اوس بھی ہے کہیں کہیں لر زاں
بزمِ انجُم دھوا ں دھواں بھی ہے

کچھ تو موسم بھی ہے خیال انگیز
کچھ طبعیت مری رواں بھی ہے

کچھ ترا حُسن بھی ہے ہوش رُبا
کچھ مری شوخئ بیاں بھی ہے

ہر نفس شوق بھی ہے منزل کا
ہر قدم یادِ رفتگاں بھی ہے

وجہِ تسکیں بھی ہے خیال اُس کا
حد سے بڑھ جائے تو گراں بھی ہے

زندگی جس کے دم سے ہے ناصؔر
یاد اُس کی عذابِ جاں بھی ہے



رنگ صبحوں کے راگ شاموں کے
جیسے سپنا کوئی اُداس اُداس

کیسا سنسان ہے سحر کا سماں
پتیاں محوِ یاس ، گھاس اُداس

خیر ہو شہرِ شبنم و گُل کی،
کوئی پھرتا ہے آس پاس اُداس

بیٹھے بیٹھے برس پڑیں آنکھیں
کہہ گئی پھر کسی کی آس اُداس

کوئی رہ رہ کے یاد آتا ہے
لیے پھرتی ہے کوئی باس اُداس

مل ہی جائے گا رفتگاں کا سراغ
اور کچھ دن پھرو اُداس اُداس

صبح ہونے کو ہے اُٹھو ناصرؔ
گھر میں بیٹھے ہو کیوں نراس اُداس



کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جرسِ گُل اُداس کر کے مجھے

میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستاں میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

میں رو رہا تھا مقدّر کی سخت راہوں میں
اُڑا کے لے گئے جادو تری نظر کے مجھے

میں تیرے درد کی طغیانیوں میں ڈوب گیا
پکارتے رہے تارے اُبھر اُبھر کے مجھے

ترے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انھیں راتوں میں عمر بھر کے مجھے

ذراسی دیر ٹھہرنے دے اے غمِ دنیا
بُلا رہا ہے کوئی بام سے اُتر کے مجھے

پھر آج آئی تھی اک موجۂ ہوائے طرب
سنا گئی ہے فسانے اِدھر اُدھر کے مجھے



سازِ ہستی کی صدا غور سے سُن
کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سُن

دن کے ہنگاموں کو بیکار نہ جان
شب کے پردوں میں ہے کیا غور سے سُن

چڑھتے سورج کی ادا کو پہچان
ڈوبتے دن کی ندا غور سے سُن

کیوں ٹھر جاتے ہیں دریا سرِ شام
روح کے تار بلا گور سے سُن

یاس کی چھاؤں میں سونے والے
جا گ اور شورِ درا غور سے سُن

ہر نفس دامِ گر فتاری ہے
نو گر فتارِ بلا غور سے سُن

دل تڑپ اُٹھتا ہے کیوں آخرِ شب
دو گھڑی کان لگا غور سے سُن

اِسی منزل میں ہیں سب ہجرو وصال
رہر دِ آبلہ پا غور سے سُن !

اِسی گو شے میں ہیں سب دیر و حرم
دل صنم ہے کہ خدا غور سے سُن ،

کعبہ سنسان ہے کیوں اے وا عظ
ہا تھ کانوں سے اُٹھا غور سے سُن

موت اور زیست کے اَسرار و رموز
آمری بزم میں آغور سے سُن

کای گزرتی ہے کسی کے دل پر
تو بھی اے جانِ وفا غور سے سُن

کبھی فرصت ہو تو اے صبحِ جمال
شبِ گزید وں کی دعا غور سیئسُن

ہے یہی سا عت ِ ایجاب و قبول
صُبح کی لَے کو ذرا غور سے سُن

کچھ تو کہتی ہیں چٹک کر کلیاں
کیا سنا تی ہیصبا غور سے سُن

برگِ آوارہ بھی اک مُطر ِب ہے
طائرِ نغمہ سرا غور سے سُن

رنگ منّت کشِ آواز نہیں
گُل بھی ہے ایک نوا غور سے سُن

خا مشی حاصلِ مو سیقی ہے
نغمہ ہے نغمہ نما غور سے سُن

آئنہ دیکھ کے حیران نہ ہو
نغمۂ آبِ صفا غور سے سُن

عشق کو حسن سے خالی نہ سمجھ
نالۂ اہلِ وفا غور سے سُن

دل سے ہر وقت کوئی کہتا ہے
میں نہیں تجھ سے جُدا غور سے سُن

ہر قدم راہِ طلب میں ناصرؔ
جرسِ دل کی صدا غور سے سُن



بے منّتِ خضرِ راہ رہنا
منظور ہمیں تباہ رہنا

یاروں کو نصیب سر فرازی
مجھ کو تری گردِ راہ رہنا

دل ایک عجیب گھر ہے پیارے
اس گھر میں بھی گاہ گاہ رہنا

گریۂ نیم شب نہ رہے دلوں کی رنجش
مشکل ہے بہم نباہ رہنا

بھر آئے گی آنکھ بھی کسی دن
خالی نہیں صرفِ آہ رہنا

میں ہاتھ نہیں اُسے لگاتا
اے بیگنہی گواہ رہنا

ناصرؔ یہ وفا نہیں جنوں ہے
اپنا بھی نہ خیر خواہ رہنا !



قہر سے دیکھ نہ ہر آن مجھے
آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے

یک بیک آکے دکھا دو جھمکی
کیوں پھراتے ہو پریشان مجھے

ایک سے ایک نئی منزل میں
لیے پھرتا ہے ترا دھیان مجھے

سُن کے آوازۂ گُل کچھ نہ سُنا
بس اُسی دن سے ہُوئے کان مجھے

جی ٹھکانے نہیں جب سے ناصرؔ
شہر لگتا ہے بیابان مجھے

۱۹۵۳ء



وہ ہُوا ن پھر درِ میخانۂ گُل
پھر صبا لائی ہے پیمانۂ گُل

زمزمہ ریز ہُوئے اہلِ چمن
پھر چرا غاں ہُوا کا شا نۂ گُل

رقص کرتی ہُوئی شبنم کی پری
لے کے پھر آ ئی ہے نذرانہ گُل

پُھول بر سائے یہ کہہ کر اُس نے
میرا دیوانہ ہے دیوانہ گُل

پھر کسی گُل کا اشارہ پا کر
چاند نکلا سرِ میخانہ گُل

پھر سرِ شام کوئی شعلہ نوا
سوگیا چھیڑ کے افسانہ گُل

آج غربت میں بہت یاد آیا
اے وطن تیرا صنم خانۂ گُل

آج ہم خاک بسر پھرتے ہیں
ہم سے تھی رونقِ کا شا نۂ گُل

ہم پہ گزرے ہیں خزاں کے صدمے
ہم سے پوچھے کوئی افسانہ گل

کل ترا دَور تھا اے بادِ صبا
ہم ہیں اب سُرخئی افسانئہ گُل

ہم ہی گُلشن کے امیں ہیں ناصرؔ
ہم سا کوئی نہیں بیگانئہ گُل



جب سے دیکھا ہے ترے ہات کا چاند
میں نے دیکھا ہی نہیں رات کا چاند

زلفِ شب رنگ کے صدرا ہوں میں
میں نے دیکھا ہے طلسمات کا چاند

رَس کہیں ، رُوپ کہیں ، رنگ کہیں
ایک جادو ہے خیالات کا چاند



جب تلک دم رہا ہے آنکھوں میں
ایک عالم رہا ہے آنکھوں میں

گریہ پیہم رہا ہے آنکھوں میں
رات بھر نم رہا ہے آنکھوں میں

اُس گُلِ تر کی یاد میں تا صبح
رقصِ شبنم رہا ہے آنکھوں میں

صبحِ رخصت ابھی نہیں بھُولی
وہ سماں رم رہا ہے آنکھوں میں

دل میں اک عمر جس نے شور کیا
وہ بہت کم رہا ہے آنکھوں میں

کبھی دیکھی تھی اُس کی ایک جھلک
رنگ سا جم رہا ہے آنکھوں میں



کون اس راہ سے گزرتا ہے
دل یوٗ نہی انتظار کرتا ہے

دیکھ کر بھی نہ دیکھنے والے
دل تجھے دیکھ دیکھ ڈرتا ہے

شہرِ گُل میں کٹی ہے ساری رات
دیکھیے دن کہاں گزرتا ہے

دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر
کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے

دل تو میرا اُداس ہے ناصرؔ
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے



چمن در چمن وہ رمق اب کہاں
وہ شعلے شفق تا شفق اب کہاں

کراں تا کراں ظلمتیں چھا گئیں
وہ جلوے طبق در طبق اب کہاں

بجھی آتشِ گُل اندھیرا ہُوا
وہ اُجلے سنہرے ورق اب کہاں

برا بر ہے ملنا نہ مِلنا ترا
بچھڑنے کا تجھ سے قلق اب کہاں

☆

بے حجابانہ انجمن میں آ
کم سخن محفلِ سخن میں آ

اے مرے آہوئے رمیدہ کبھی
دل کے اُجڑے ہُوئے خُتن میں آ

دل کہ تیرا تھا اب بھی تیرا ہے
پھر اسی منزلِ کہن میں آ

اے گلستان ِ شب کے چشم و چراغ
کبھی اُجڑے دلوں کے بَن میں آ

کبھی فرصت ملے تو پچھلے پہر
شب گُزیدوں کی انجمن میں آ

صبحِ نورس کی آنکھ کے تارے
چاند مرجھا گیا گہن میں ، آ

رنگ بھر دے اندھیری راتوں میں
جانِ صبحِ وطن! وطن میں آ

پھول جھڑنے کی شام آ پہنچی
نو بہارِ چمن! چمن میں آ

☆

دَم گھٹنے لگا ہے وضعِ غم سے
پھر زور سے قہقہہ لگاؤ

پھر دل کی بساط اُلٹ نہ جائے
اُمّید کی چال میں نہ آؤ

میں درد کے دن گزار لوں گا
تم جشنِ شبِ طرب مناؤ

کچھ سَہل نہیں ہمارا ملنا
تابِ غمِ ہجر ہے تو آؤ



تارے گِنوائے یا سحر دکھلائے
دیکھیے شامِ غم کہاں لے جائے

صبحِ نورس کا راگ سُنتے ہی
شبِ گُل کے چراغ مرجھائے

صبح نکلے تھے فکرِ دنیا میں
خانہ برباد ڈھلے آئے

کیوں نہ اُس کم نما کو چاند کہوں
چاند کو دیکھ کر جو یاد آئے



دُور اِس تیرہ خاکداں سے دُور
دیکھ دنیائے جسم و جاں سے دور

آنے والی بہار کے افسوس
دیکھ ویرانۂ خزاں سے دُور

پُھول جلتے ہیں شاخچوں سے جُدا
شمع روتی ہے شمعداں سے دُور

شہر خلقِ خدا سے بیگانہ
کارواں میرِ کارواں سے دُور

تیرے زندانیوں کی کون سُنے
برق چمکی ہے آشیاں سے دُور

چیختی ہیں ڈراؤنی راتیں
چاند نکلا ہے آسماں سے دُور

سو گیا پچھلی رات کا جادو
کوئی اب لے چلے یہاں سے دُور

دل عجب گوشۂ فراغت ہے
کیوں بھٹکتے ہو اس مکاں سے دُور

کوئی سُنتا نہیں یہاں ناصرؔ
بات دل کی رہی زباں سے دور



چاند نکلا تو ہم نے وحشت میں
جس کو دیکھا اُسی کو چُوم لیا

رس کے معنی جسے نہیں معلوم
ہم نے اُس رس بھری کو چُوم لیا

پُھول سے ناچتے ہیں ہونٹوں پر
جیسے سچ مُچ کسی کو چُوم لیا



لبِ معجز بیاں نے چھین لیا
دل کا شعلہ زباں نے چھین لیا

دل مرا شب چراغ تھا جس کو
مژۂ خوں فشاں نے چھین لیا

عمر بھر کی مسرتوں کا خُمار
خلشِ ناگہاں نے چھین لیا

تیرا ملنا تو خیر مشکل تھا
تیرا غم بھی جہاں نے چھین لیا

آکے منزل پہ آنکھ بھر آئی
سب مزہ رفتگاں نے چھین لیا

ہر گھڑی آسماں کو تکتا ہوں
جیسے کچھ آسماں نے چھین لیا

باغ سنسان ہو گیا ناصر
آج وہ گُل خزاں نے چھین لیا



آنکھوں میں ہیں دُکھ بھرے فسانے
رونے کے پھر آ گئے زمانے

پھر درد نے آگ راگ چھیڑا
لوٹ آئے وہی سمے پُرانے

پھر چاند کو لے گئیں ہوائیں
پھر بانسری چھیڑ دی صبا نے

رستوں میں اُداس خوشبوؤں کے
پُھولوں نے لُٹا دیے خزانے



قفس کو چمن سے سوا جانتے ہیں
ہر اک سانس کو ہم صبا جانتے ہیں

لہو رو کے سینچا ہے ہم نے چمن کو
ہر اک پھول کا ما جرا جانتے ہیں

جسے نغمۂ نے سمجھتی ہے دنیا
اُسے بھی ہم اپنی صدا جانتے ہیں

اشارا کرے جو نئی زند گی کا
ہم اُس خود کُشی کو روا جانتے ہیں

تری دُھن میں کوسوں سفر کرنے والے
تجھے سنگِ منزل نما جانتے ہیں

آہ پھر نغمہ بنا چا ہتی ہے
خامُشی طر زِ ادا چاہتی ہے

آج پھر وُسعتِ صحرائے جنوں
پر سشِ آبلہ پا چا ہتی ہے

دیکھ کیفیت طو فان ِبہار
بُوئے گُل رنگ ہُوا چا ہتی ہے

موت آرائشِ ہستی کے لئے
خندۂ زخمِ وفا چاہتی ہے

دل میں اب خارِ تمنّا بھی نہیں
زندگی برگ و نوا چاہتی ہے

سوچ اے دشمنِ اربابِ وفا
کیوں تجھے خلقِ خدا چاہتی ہے

اک ہمیں بارِ چمن ہیں ورنہ
غنچے غنچے کو صبا چاہتی ہے



ہر ادا آبِ رواں کی لہر ہے
جسم ہے یا چاند کی شہر ہے

پھر کسی ڈوبے ہُوئے دن کا خیال
پھر وہی عبرت سرائے دہر ہے

اُڑ گئے شاخوں سے یہ کہہ کر طیور
اس گُلستاں کی ہوا میں زہر ہے



شبنم آلود پلک یاد آئی
گُلِ عارض کی جھلک یاد آئی

پھر سلگنے لگے یادوں کے کھنڈر
پھر کوئی تاکِ خنک یاد آئی

کبھی زلفوں کی گھٹا نے گھیرا
کبھی آنکھوں کی چمک یاد آئی

پھر کسی دھیان نے ڈیرے ڈالے
کوئی آوارہ مہک یاد آئی

پھر کوئی نغمہ گلو گیر ہُوا
کوئی بے نام کسک یاد آئی

ذرّے پھر مائلِ رَم ہیں ناصرؔ
پھر اُنھیں سیرِ فلک یاد آئیں



عشق جب زمزمہ پیرا ہو گا
حسن خود محوِ تماشا ہو گا

سُن کے آوازۂ زنجیرِ صبا
قفسِ غنچہ کا در وا ہوگا

جرسِ شوق اگر ساتھ رہی
ہر نفس شہپرِ عَنصتا ہو گا

دائم آباد رہے گی دُنیا
ہم نہ ہونگے کوئی ہم سا ہوگا

کون دیکھے گا طلوعِ خورشید
ذرّہ جب دیدۂ بینا ہوگا

ہم تجھے بھول کے خوش بیٹھے ہیں
ہم سا بیدرد کوئی کیسا ہو گا

پھر سُلگنے لگا صحرائے خیال
ابرَگھر کر کہیں برسا ہو گا

پھر کسی دھیان کے صدراہے پر
دلِ حیرت زدہ تنہا ہو گا

پھر کسی صبحِ طرب کا جادو
پردۂ شب سے ہویدا ہوگا

گُل زمینوں کے خنک رمنوں میں
جشنِ رامش گری برپا ہو گا

پھر نئی رُت کا اشارہ پا کر
وہ سمن بُو چمن آرا ہو گا

گُلِ شب تاب کی خوشبو لے کر
ابلقِ صبح روانہ ہو گا

پھر سرِ شاخِ شعاعِ خورشید
نکہتِ گُل کا بسیرا ہو گا

اک صدا سنگ میں تڑپی ہو گی
اک شرر پھول میں لرزا ہو گا

تجھ کو ہر پھول میں عریاں سوتے
چاندنی رات نے دیکھا ہوگا

دیکھ کر آئینۂ آبِ رواں
پتّہ پتّہ لبِ گویا ہوگا

شام سے سوچ رہا ہوں ناصرؔ
چاند کس شہر میں اُترا ہو گا

۱۹۵۳ء

تا

۱۹۵۷ء



کچھ احساسِ زیاں تھا پہلے
دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے

اب تو جھونکے سے لرز اُٹھتا ہوں
نشۂ خوابِ گراں تھا پہلے

اب تو منزل بھی ہے خود گرمِ سفر
ہر قدم سنگِ نشاں تھا پہلے

سفرِ شوق کے فرسنگ نہ پوچھ
وقت بے قیدِ مکاں تھا پہلے

یہ الگ بات کہ غم راس ہے اب
اس میں اندیشۂ جاں تھا پہلے

یوں نہ گھبرائے ہُوئے پھرتے تھے
دل عجب کُنجِ اماں تھا پہلے

اب بھی تو پاس نہیں ہے لیکن
اس قدر دور کہاں تھا پہلے

ڈیرے ڈالے ہیں بگولوں نے جہاں
اُس طرف چشمہ رواں تھا پہلے

اب وہ دریا ،نہ وہ بستی ، نہ وہ لوگ
کیا خبر کون کہاں تھا پہلے

ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے
میں بھی آباد مکاں تھا پہلے

اُڑ گئے شاخ سے یہ کہہ کے طُیور
سر واک شوخ جواں تھا پہلے

کیا سے کیا ہو گئی دنیا پیارے
تو وہیں پر ہے جہاں تھا پہلے

ہم نے آباد کیا ملکِ سخن
کیسا سنسان سماں تھا پہلے

ہم نے بخشی ہے خموش کو زباں
درد مجبورِ فغاں تھا پہلے

ہم نے ایجاد کیا تیشۂ عشق
شعلہ پتھر میں نہاں تھا پہلے

ہم نے روشن کیا معمُور ہٗ غم
ورنہ ہر سَمت دھواں تھا پہلے

ہم نے محفوظ کیا حُسنِ بہار
عطرِ گُل صرفِ خزاں تھا پہلے

غم نے پھر دل کو جگایا ناصؔر
خانہ برباد کہاں تھا پہلے ؟



آئینہ لے کے صبا پھر آئی
بجھتی آنکھوں میں ضیا پھر آئی

تازہ رس لمحوں کی خوشبو لے کر
گُل زمینوں کی ہوا پھر آئی

سرمئی دیس کے سپنے لے کر
شبنمِ زمزمہ پا پھر آئی

پھر چمکنے لگیں سُونی راہیں
سار بانوں کی صدا پھر آئی

پھر کوئی قافلہ گزرا ناصؔر
وہی آوازِ درا پھر آئی



کیوں غمِ رفتگاں کرے کوئی
فکرِ واماندگاں کرے کوئی

تیرے آوارگانِ غربت کو
شاملِ کارواں کرے کوئی

زندگی کے عذاب کیا کم ہیں
کیوں غمِ لا مکاں کرے کوئی

دل ٹپکنے لگا ہے آنکھوں سے
اب کسے رازداں کرے کوئی

اس چمن میں برنگِ نکہتِ گُل
عمر کیوں رائیگاں کرے کوئی

شہر میں شور، گھر میں تنہائی
دل کی باتیں کہاں کرے کوئی

یہ خرابے ضرور چمکیں گے
اعتبارِ خزاں کرے کوئی



کس کے جلووں کی دھوپ برسی ہے
آج تو شام بھی سحر سی ہے

اہلِ غم ہیں کہ صبح کی تصویر
دل بجھا سا ہے آنکھ ترسی ہے

کیوں نہ کھینچے دلوں کو ویرانہ
اُس کی صورت بھی اپنے گھر سی ہے

بے ثمر ہی رہی ہے شاخِ مُراد
برف پگھلی تو آگ برسی ہے

دل میں اب کیا رہا ہے تیرے بعد
ایک سنسان رہگزر سی ہے

صبح تک ہم نہ سو سکے ناصؔر
رات بھر کتنی اوس برسی ہے



نِت نئے سوچ میں لگے رہنا
ہمیں ہر حال میں غزل کہنا

صحنِ مکتب میں ہمسِنوں کے ساتھ
سنگریزوں کو ڈھونڈتے رہنا

گھر کے آنگن میں آدھی آدھی رات
مِل کے باہم کہانیاں کہنا

دن چڑھے چھاؤں میں ببولوں کی
رَمِ آہو کو دیکھتے رہنا

ابر پاروں کو، سبزہ زاروں کو
دیکھتے رہنا سوچتے رہنا

شہر والوں سے چھپ کے پچھلی رات
چاند میں بٹھ کر غزل کہنا

ریت کے پُھول آگ کے تارے
یہ ہے فصلِ مراد کا گہنا

سوچتا ہوں کہ سنگِ منزل نے
چاندنی کا لباس کیوں پہنا

کیا خبر کب کوئی کرن پھُوٹے
جاگنے والوں جاگتے رہنا

☆

سر میں جطب عشق کا سوادانہ رہا
کیا کہیں زیست میں کیا کیا نہ رہا

اب تو دنیا بھی وہ دنیا نہ رہی
اب ترا دھیان بھی اُتنا نہ رہا

قصۂ شوق سناؤں کس کو
راز داری کا زمانا نہ رہا

زندگی جس کی تمنّا میں کٹی
وہ مرے حال سے بیگانہ رہا

ڈیرے ڈالے ہیں خزاں نے چوندیس
گُل تو گُل باغ میں کانٹا نہ رہا

دن دھاڑے یہ لہو کی ہولی
خلق کو خوف خدا کا نہ رہا

اب تو سو جاؤ ستم کے مارو
آسماں پر کوئی تارا نہ رہا

☆

مدّت ہُوئی کہ سیرِ چمن کو ترس گئے
گُل کیا غبارِ بُوئے سمن کو ترس گئے

ہاں اے سکوتِ تشنگئ درد کچھ تو بول
کانٹے زباں کے آبِ سخن کو ترس گئے

دل میں کوئی صدا ہے نہ آنکھوں میں کوئی رنگ
تن کے رفیق صحبتِ تن کو ترس گئے

اِس عہدِ نو میں قدرِ متاعِ وفا نہیں
اس رسم وراہِ عہدِ کہن کو ترس گئے

منزل کی ٹھنڈکوں نے لہو سرد کردیا
جی سُست ہے، کہ پاؤں چھبن کو ترس گئے

اندھیرے ہے کہ جلوۂ جاناں کے باوجود
لوچے نظر کے ایک کرن کو ترس گئے



خواب میں رات ہم نے کیا دیکھا
آنکھ کُھلتے ہی چاند سا دیکھا

کیاریاں دُھول سے اَٹی پائیں
آشیانہ جلا ہُوا دیکھا

فاختہ سرنگوں ببولوں میں
پُھول کو پُھول سے جُدا دیکھا

اُس نے منزل پہ لا کے چھوڑ دیا
عمر بھر جس کا راستا دیکھا

ہم نے موتی سمجھ کے چُوم لیا
سنگ ریزہ جہاں پڑا دیکھا

کم نما ہم بھی ہیں مگر پیارے
کوئی تجھ سانہ کود نما دیکھا



رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر کی رفتار بھی
بال چاندی ہو گئے سونا ہُوئے رخسار بھی

درد کے جھونکوں نے اب کی دل ہی ٹھنڈا کر دیا
آگ برساتا تھا آگے دیدۂ خونبار بھی

بیٹھے بیٹھے جانے کیوں بیتاب ہو جاتا ہے دل
پوچھتے کیا ہو میاں اچھا بھی ہوں بیمار بھی

شوقِ آزادی لیے جاتا ہے عالم سے پرے
روکتی ہے ہر قدم آوازِ پائے یار بھی

سادگی سے تم نہ سمجھے ترکِ دنیا کا سبب
ورنہ وہ درویش تھے پردے میں دنیا دار بھی

کس طرح گزرے گا ناصر فرصتِ ہستی کا دن
جم گیا دیوار بن کر سایۂ دیوار بھی



بیگانہ وار اُن سے ملاقات ہو تو ہو
اب دُور دُور ہی سے کوئی بات ہو تو ہو

مشکل ہے پھر ملیں کبھی یارانِ رفتگاں
تقدیر ہی سے اب یہ کرامات ہو تو ہو

اُن کو تو یاد آئے ہُوئے مدتیں ہُوئیں
جینے کی وجہ اور کوئی بات ہو تو ہو

کیا جانوں کیوں اُلجھتے ہیں وہ بات بات پر
مقصد کچھ اس سے ترکِ ملاقات ہو تو ہو



حس کو دل میں چھپا کر دیکھو
دھیان کی شمع جلا کر دیکھو

کیا خبر کوئی دفینہ مل جائے
کوئی دیوار گرا کر دیکھو

فاختہ چُپ ہے، بڑی دیر سے کیوں
سرو کی شاخ ہلاکر دیکھو

کیوں چمن چھوڑ دیا خوشبُو نے
پھول کے پاس تو جاکر دیکھو

نہر کیوں سو گئی چلتے چلتے
کوئی پتھر ہی گرا کر دیکھو

دل میں بیتاب ہیں کیا کیا منظر
کبھی اِس شہر میں آکر دیکھو

ان اندھیروں میں کرن ہے کوئی
شب زدو آنکھ اُٹھا کر دیکھو



وہ اِس ادا سے جو آئے تو کیوں بھلا نہ لگے
ہزار بار پھر بھی آشنا نہ لگے

کبھی وہ خاص عنایت کہ سو گُماں گُزریں
کبھی وہ طرزِ تغافل کہ محرمانہ لگے

وہ سیدھی سادی ادائیں کہ بجلیاں برسیں
وہ دلبرانہ مروت کہ عاشقانہ لگے

دکھاؤں داغِ محبت جو ناگوار نہ ہو
سناؤں قصّہ فرقت اگر بُرا نہ لگے

بہت ہی سادہ ہے تُو اور زمانہ ہے عیار
خدا کرے کہ تجھے شہر کی ہَوا نہ لگے

بجھا نہ دیں یہ مسلسل اداسیاں دل کو
وہ بات کر کہ طبیعت کو تازیانہ لگے

جو گھر اُجڑ گئے اُن کا نہ رنج کر پیارے
وہ چارہ کر کہ یہ گُلشن اُجاڑ سا نہ لگے

عتابِ اہلِ جہاں سب بُھلا دیے لیکن
وہ زخم یاد ہین اب تک جو غائبانہ لگے

وہ رنگ دل کو دیے ہیں لہو گردش نے
نظر اُٹھاؤں تو دنیا نگار خانہ لگے

عجیب خواب دکھاتیھ ہیں ناخدا ہم کو
غرض یہ ہے کہ سفینہ کنارے جا نہ لگے

لیے ہی جاتی ہے ہر دم کوئی صدا ناصؔر
یہ اور بات سُراغِ نشان یہ نہ لگے

برگ ریز



یہ چمن میں پھر رسن وطوق و دار کے دن ہیں
کہاں پڑے ہو اسیرو! بہار کے دن ہیں

یہ شعوروزنِ زنداں سے صاف سنتا ہُوں
کوئی کہے نہ کہے یہ بہار کے دن ہیں



اُسکے آنے کی کچھ کہو یارو
نیندتو خیر آ ہی جائے گی

منہ لپیٹے پڑے رہو ناصؔر
ہجر کی رات ڈھل ہی جائے گی



فرصت موسمِ نشاط نہ پوچھ
جیسے اک خواب خواب میں دیکھا



نہ پوچھ آج شبِ ہجر کس قدر ہے اُداس
کہیں کہیں کوئی تارا ہے اور کچھ بھی نہیں

رواں دواں ہیں سفینے تلاش میں جس کی
وہ اک شکستہ کنارا ہے اور کچھ بھی نہیں



یہ آج کون سے طوفان میں ہے سفینۂ دل
کہ دُور دور کنارے نظر نہیں آتے

ہجومِ یاس ہے اور منزلوں اندھیرا ہے
وہ رات ہے کہ ستارے نظر نہیں آتے



ہم نے تجھ کو لاکھ پکارا تو لیکن خاموش رہا
آخر ساری دُنیا سے ہم تیرے بہانے روٹھ گئے



بیٹھے بیٹھے گھبرائے ہم
جانے کس کو یاد آئے ہم



اسیرو کچھ نہ ہو گا شور و شر سے
لپٹ کر سو رہو زنجیرِ در سے



کیا کمی آ گئی وفاؤں میں
وہ اثر ہی نہیں دعاؤں میں



بھٹک رہا ہے جہاں قافلہ بگولوں کا
کبھی ہجوم تھا ان راستوں میں پھولوں

کیا بلا آسمان سے اتری
اُس کی صورت بھی دھیان سے اُتری

گھر میں اس شعلہ رُو کے آتی ہے
روشنی شمعدان سے اُتری

☆

رین اندھیری ہے اور کنارا دُور
چاند نکلے تو پارا اُتر جائیں
یوں پریشاں ہوئیں تری یادیں
جیسے اوراقِ گُل بکھر جائیں

☆

پَر سوختہ پتنگے شمعیں بجھی بجھی سی
سل سوز ہیں مناظر بزمِ سحر گہی سے

☆

گھر لُٹا کر وطن میں جی نہ لگا
پھر کسی انجمن میں جی نہ لگا

☆

تم ہی کہو اے انجمِ شب
کتنی دُور ہے شہرِ طرب

☆

اُٹھی تھی آج دل سے پھر اک آواز
اُلجھ کر رہ گئی تارِ گلو سے

☆

گُھٹ کے مرجاؤں گا اے صبحِ جمال
میں اندھیرے میں ہوں آواز نہ دے



کوئی جھونکا جو سرِ شام آیا
میں یہ سمجھا ترا پیغام آیا

زندگی اُس کے تصور میں کٹی
دُور رہ کر بھی وہی کام آیا



دن کا چراغ نکلا گُل ہو گئے ستارے
دنیا کے شور وغل میں دل اب کسے پُکارے



اے دل نہ تڑپ کہ قہر ہوگا
رسوا کوئی شہر شہر ہوگا



عالمِ خواب میں دکھائے گئے
کب کے ساتھی کہاں ملائے گئے



کسی گردش میں اب کے سال پڑا
جنگ سر سے ٹلی تو کال پڑا

تجھ سے مِل کر بھی دل کو چین نہیں
درمیاں پھر وہی سوال پڑا



نہ پُھول جھڑتے ہیں ہم پر نہ برق گرتی ہے
پڑے ہوئے ہیں بعنوانِ سبزۂ بے کار



اب دل میں کیا رہا ہے تری یاد ہو تو ہو
یہ گھ اسی چراغ سے آباد ہو تو ہو



اوّلیں شبِ گلشن کس قدر سہانی تھی
اجنبی مہک پا کر ہم نکل پڑے گھر سے



ایک تم ہی نہ مِل سکے ورنہ
ملنے والے بچھڑ بچھڑ کے ملے

روئے ہم موسمِ بہار کے بعد
اَبکی پت جھڑ میں کتنے پُھول کِھلے



سینۂ نے میں صدا میری ہے
اس میں کچھ طرزِ ادا میری ہے

باغ تیرا ہی سہی اے گُلچیں
پھول میرے ہیں صبا میری ہے



نہ پوچھو کس خرابے میں پڑے ہیں
ترا ابرِ رواں پیاسے کھڑے ہیں

ذرا گھر سے نکل کر دیکھ ناصر
چمن میں کہیں قدر پتّے جھڑے ہیں



ویراں پڑا ہے میکدہ حسنِ خیال کا
یہ دَور ہے بہائے ہُنر کے زوال کا



ڈھونڈیں گے لوگ مجھ کو ہر محفلِ سخن میں
ہر دَور کی غزل میں میرا نشاں ملے گا

____ انتہا ____